© rasailojaraid.com

دورِ حاضر کا ایک عظیم بُت

مولانا عبدالرحمن کیلانی

قسط - ۳

مغربی جمہوریت

(۳)

اسلامی ریاست کے خدوخال

مغربی جمہوریت اور دوسرے "ازموں" سے تقابل

اسلام میں سیاسی تنظیم ایک اخلاقی بنیاد رکھتی ہے۔ اسلامی ریاست کا قیام بذاتِ خود مقصد نہیں ہے۔ بلکہ یہ کسی دوسرے عظیم مقصد کے حصول کا ذریعہ ہے۔ اور وہ مقصد عمدہ عالمی نظام قائم کرنا اور انسانیت کی تعمیر اور بلندی ہے۔ ظاہر ہے کہ جس ریاست کی بنیاد اخلاقی اقدار پر ہو گی وہ خودسر اور غیر ذمہ دار نہیں ہو سکتی۔ حکومت خواہ کسی طرز کی ہو۔ اگر اس سے اخلاقی اقدار کو جدا کر لیا جائے تو وہ موقع پرستی اور استبداد کی شکل اختیار کر لیتی ہے۔ اخلاقی بنیادیں اسلامی طرزِ حکومت کو دوسری تمام اقسام سے ممتاز کر دیتی ہے یہاں نہ تو سربراہِ مملکت مطلق العنان اور کسی خاص خاندان یا طبقہ سے تعلق رکھتا ہے۔ اور نہ ہی اس جمہوریت میں بے مہار اظہارِ رائے کا حق تسلیم کیا گیا ہے۔ بالفاظِ دیگر ہم یوں کہہ سکتے ہیں کہ اسلامی جمہوریت، ملوکیت اور جمہوریت کا ایسا حسین امتزاج ہے جس میں ان کی خوبیاں تو پوری طرح سمو دی گئی ہیں لیکن برائیوں کا مکمل طور پر قلع قمع کیا گیا ہے۔ اس ریاست کا مختصر خاکہ درج ذیل ہے:۔

۱۔ آئین

اسلامی ریاست کا آئین قرآن و سنت پر مبنی ہے۔ گویا آئین کے بنیادی اصول استوار (RIGID) یا غیر متبدل ہیں جو کسی بھی دور اور ملک میں تبدیل نہیں کیے جا سکتے۔ ایسے قوانین جن کی جزئیات کا تذکرہ نہیں کیا گیا، قانون کا یہ حصہ لچک دار (FLEXIBLE) ہے۔ یہ جزئیات ہر دور اور ملک کے تقاضوں کے مطابق مجلس شوریٰ یا مقننہ طے کر سکتی ہے۔ گویا آئین کا بنیادی حصہ تاقیامت آنے والی حکومتوں کی دستبرد سے محفوظ کر دیا گیا ہے۔ جس سے ملک و ملت کو استحکام نصیب ہوتا ہے۔

۲۔ حاکمیت کا تصور

اسلامی ریاست میں اقتدارِ اعلیٰ خود اللہ تعالیٰ ہوتا ہے۔ سربراہ مملکت، مجلس شوریٰ اور رعایا کا ایک عام فرد سب کے سب اپنے اپنے دائرۂ اقتدار و اختیار کے مطابق خدا تعالیٰ کے سامنے جوابدہ

© rasailojaraid.com

© rasailojaraid.com

ہیں۔ سربراہِ مملکت کے لیے ضروری ہے کہ وہ تمام امور مجلسِ شوریٰ کے مشورہ سے سرانجام دے تاہم اپنی خداداد بصیرت کی بنا پر وہ مجلسِ شوریٰ کا فیصلہ بہرحال قبول کرنے پر مجبور نہیں ہے۔ گویا اسلامی جمہوریت پارلیمانی نظام کے بجائے صدارتی نظام سے زیادہ مشابہت رکھتی ہے۔ خلیفہ پر تنقید کا حق رعایا کے ہر فرد کو حاصل ہے بشرطیکہ یہ تنقید قرآن وسنت کے مطابق اور اخلاقی اقدار کی سربلندی کے لیے ہو۔ قانونی لحاظ سے سربراہِ مملکت اور ایک عام آدمی میں کوئی فرق نہیں اور نہ عدلیہ کی یہ ذمہ داری ہے کہ کسی جھگڑا کے مقدمے میں فریقین سے یکساں سلوک کرے۔ وجہ یہ ہے کہ ریاست کے تمام افراد کو کلمۃ الحق کی ذمہ داری سپرد کی گئی ہے۔ صرف دائرۂ کار و اختیار میں فرق ہوتا ہے۔ ان حدود و قیود کی وجہ سے اسلامی ریاست کا سربراہ کبھی مطلق العنان نہیں بن سکتا۔ اس کی اطاعت صرف اس حد تک قابل قبول ہے کہ وہ قرآن وسنت کے مطابق ہو۔ بصورتِ دیگر اس کی اطاعت رعایا پر لازم نہیں۔ ان باتوں سے واضح ہے کہ اسلامی ریاست میں اقتدارِ اعلیٰ اللہ تعالیٰ کی ذات ہے اور سربراہِ مملکت خدا کے احکام کے نفاذ کا ذمہ دار خلیفہ ہوتا ہے اور اس خلافت کی ذمہ داری میں ساری رعایا برابر کی حصہ دار ہوتی ہے۔

۳۔ جمہوریت کی روح

اسلامی ریاست میں ملت کو یہ حق حاصل ہے کہ وہ اپنے میں سے بہترین آدمی کو بطور سربراہ مملکت منتخب کرے لیکن کسی خاص طرزِ انتخابات کی تفصیلات بیان نہیں کی گئیں جس سے صاف واضح ہے کہ یہ طریق کار زمانہ کے بدلتے تقاضوں میں امت کی صوابدید پر چھوڑ دیا گیا ہے۔ خلافتِ راشدہ میں ہمیں اس طرزِ انتخاب کے تین مختلف طریقے ملتے ہیں۔

۱۔ حضور اکرمؐ کی وفات کے بعد حضرت ابوبکرؓ کا انتخاب تھوڑی بہت رد و کد کے بعد مسلمانوں کے عام اجتماع بمقام سقیفہ بنی ساعدہ میں ہوا۔ اس اجتماع میں معززین صحابہ کرام نے حضرت ابوبکرؓ کو منتخب کیا بعد میں عام بیعت ہوئی۔

۲۔ حضرت ابوبکرؓ نے اپنی وفات سے بیشتر معززین صحابہ کرامؓ سے حضرت عمرؓ کی نامزدگی کے متعلق مشورے کیے بعض اعتراضات کے معقول جواب بھی دیئے اور جب معززین امت کا اس نامزدگی پر اتفاق ہو گیا۔ تو نامزدگی کا اعلان کر دیا گیا۔

۳۔ حضرت عمرؓ نے اپنی وفات سے پیشتر خلیفہ کے انتخاب کے لیے چھ معزز صحابہؓ کی ایک سب کمیٹی کو تشکیل دیا یہ سب صحابہؓ مجلس شوریٰ کے ممبر اور عشرہ مبشرہ میں سے تھے ان اصحابؓ نے یہ ذمہ داری حضرت عبدالرحمٰن بن عوفؓ کے ذمہ ڈال دی آپ نے تین دن اور راتیں لوگوں کے صلاح مشورے میں گزار دیں اور اس طرح بالآخر حضرت عثمانؓ کا انتخاب عمل میں آیا۔

اسلام میں طرزِ انتخاب کی پوری وضاحت حضرت علیؓ کے قول سے ملتی ہے جو حضرت عثمانؓ کی شہادت کے بعد جب مہاجرین و انصار کے چند بزرگوں نے آپ سے خلافت کا بار اٹھانے کی درخواست کی تو آپ نے فرمایا[1]

© rasailojaraid.com

[1] ابن قتیبہ۔ الامامۃ والسیاسۃ۔ ج ۱ ص۔ ۴۱

© rasailojaraid.com

"تمہیں کسی خلیفہ بنانے کا اختیار نہیں ہے یہ تو اہل شوریٰ اور اہل بدر کا کام ہے جسے وہ خلیفہ بنانا چاہیں وہی خلیفہ ہو گا ہم جمع ہوں گے اور اس معاملہ پر غور کریں گے"
چنانچہ مسجد نبوی میں بر سرِ عام یہ اجتماع ہوا۔ اور حضرت علیؓ کا باقاعدہ انتخاب عمل میں لایا گیا تب آپ نے اسے قبول کیا۔

غور فرمایئے! ان تینوں صورتوں میں جمہوریت کی روح کارفرما ہے۔ سربراہ مملکت اپنی وفات سے پیشتر خلیفہ نامزد کر سکتا ہے بشرطیکہ نامزدگی معززین امت کے مشورہ اور افہام و تفہیم سے ہو۔ اور دوسرے یہ کہ جانشین اس کا رشتہ دار نہ ہو۔ اسلام کے طرزِ انتخاب کی اس خصوصیت نے بھی اسے ملوکیت سے ممتاز کر دیا ہے۔ خلیفہ کے انتخاب کے لیے کسی مخصوص خاندان، طبقہ، یا نسل کی کوئی شرط نہیں ہے۔

۴۔ مقصدیت کی بالادستی

طرزِ انتخاب کے مندرجہ بالا تین طریقے ہی اقرب الی الحق قرار دیئے گئے ہیں۔ یہ اسی صورت میں نافذ العمل ہو سکتے ہیں جب پہلے اسلامی ریاست کا قیام اور مجلس شوریٰ کا قیام عمل میں آ چکا ہو۔ ایک غیر شرعی یا غیر اسلامی ریاست میں لامحالہ دوسرے ہی ذرائع استعمال کرنا پڑتے ہیں جو مختلف حالات میں مختلف قسم کے ہو سکتے ہیں۔ مثلاً:۔

۱۔ حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے ہجرت اور پھر جہاد کے ذریعے اسلامی ریاست قائم فرمائی۔

۲۔ بنی اسرائیل نے اپنے نبی سے مطالبہ کیا کہ خدا تعالیٰ ان کے لیے کوئی بادشاہ مقرر کر دے۔ تو اللہ تعالیٰ نے طالوت کو ان کا بادشاہ نامزد فرمایا۔

۳۔ حضرت یوسف علیہ السلام نے شاہ مصر سے خود وزارتِ خزانہ کے لیے استدعا کی۔ کیونکہ اگر آپ جیسا امین اور مدبر آدمی مالیاتِ مصر پر کنٹرول نہ کرتا تو یہ ملک بہت جلد تباہ ہو سکتا تھا۔

مندرجہ بالا تصریحات سے واضح ہے کہ اسلامی ریاست کا طرزِ انتخاب اصل مقصد نہیں ہے۔ بلکہ اعلائے کلمۃ الحق اور انسانیت کی تعمیر یا شریعت کا نفاذ اصل مقصد ہے۔ اگر کوئی شخص کسی غیر جمہوری طریقے سے اقتدار حاصل کر کے اسلامی ریاست کے تقاضے پورے کرتا ہے تو وہ جائز سربراہ مملکت متصور ہوگا۔ اور اس کے دورِ اقتدار کے تمام فیصلے قانونی لحاظ سے درست متصور ہوں گے۔ اسے یہ طعنہ دینا ناجائز ہے کہ چور دروازے سے اقتدار پر قابض ہو گیا ہے۔ ایک اسلامی ریاست کے مقاصد یہ ہیں:

۱۔ ملک سے ظلم و جور کا خاتمہ کر کے عدل و انصاف قائم کیا جائے ۲۔ نماز اور زکوٰۃ کا نظام قائم کیا جائے ۳۔ مکروہ کاموں کی روک تھام اور نیک کاموں کی حوصلہ افزائی کی جائے ۴۔ اور جو قوتیں اس نظام کی راہ میں رکاوٹ کا سبب بنتی ہیں ان کو دور کیا جائے۔ اور اسی کا نام جہاد ہے۔

© rasailojaraid.com

© rasailojaraid.com

ایک غیر اسلامی ریاست کی ذمہ داریاں محض یہ ہیں کہ پولیس کے ذریعے امن بحال رکھا جائے، انتظامیہ کے ذریعہ حکومت کا کاروبار چلایا جائے اور فوج کے ذریعہ سرحدوں کی حفاظت کی جائے۔ لیکن ایک اسلامی ریاست کا بنیادی مقصد اخلاق اور کردار کی تعمیر ہے اور یہی چیز اسے دوسری تمام طرز ہائے حکومت سے ممتاز کر دیتی ہے۔

۵۔ سیاسی پارٹیوں کا فقدان

اسلامی نقطہ نظر سے معاشرہ کے صرف دو ہی فرقے یا پارٹیاں ہو سکتی ہیں۔ ایک وہ جو اللہ کی نازل کردہ شریعت پر ایمان رکھتی اور اسے دستورِ حیات بنانا چاہتی ہے۔ یہ پارٹی "حزب اللہ" یا اللہ کی پارٹی ہے۔ دوسری وہ جو اس نظام کو نہیں چاہتی خواہ وہ نام کی مسلمان ہی ہو۔ یہ پارٹی حزب الشیطٰین یا شیطانی پارٹی ہے۔ اس کے علاوہ تیسری کوئی سیاسی پارٹی نہیں ہو سکتی۔ شیطانی پارٹی یا دین بیزار طبقہ اسلامی طرزِ انتخاب میں حصہ نہیں لے سکتا۔ اسلام پسند طبقہ اگر مختلف پارٹیاں بنائے تو قرآن و سنت سے قریب تر نظریہ رکھنے والی پارٹی کو ہی انتخاب میں حصہ لینے کا زیادہ حق دار سمجھا جائیگا اور اگر سربراہِ مملکت چاہے تو ان کی تحدید بھی کر سکتا ہے۔

اسلامی ریاست میں کسی معینہ عرصہ کے بعد الیکشن منعقد نہیں کیے جاتے۔ سربراہِ مملکت تا حینِ حیات سربراہ مملکت رہتا ہے۔ تا آنکہ وہ فسق و فجور میں مبتلا نہ ہو جائے۔ اس صورت میں رائے عامہ کی قوت سے اسے معزول کیا جا سکتا ہے لیکن اگر یہ آئینی طریقہ استعمال نہ کیا جائے تو جب تک وہ قرآن و سنت کے مطابق فیصلے کرتا ہے، مسلمانوں پر اس کی اطاعت لازم ہے۔ اندریں صورت ایک اسلامی ریاست میں لا تعداد سیاسی پارٹیوں کی ضرورت ختم ہو جاتی ہے اور ملک و ملت ان تمام نقصانات سے محفوظ رہتے ہیں جو موجودہ الیکشنوں میں ہوتے ہیں جن کی تفصیل پہلے گزر چکی ہے۔

۶۔ سربراہ مملکت کے اوصاف

ایک اسلامی ریاست کے سربراہ میں مندرجہ ذیل اوصاف ہونے چاہییں:

۱۔ مسلمان ہو

ایک اسلامی ریاست کا سربراہ صرف مسلمان ہی ہو سکتا ہے۔ دلیل یہ ہے۔

يٰٓاَيُّهَا الَّذِيْنَ اٰمَنُوْٓا اَطِيْعُوا اللّٰهَ وَاَطِيْعُوا الرَّسُوْلَ وَاُولِي الْاَمْرِ مِنْكُمْ (۴/۵۹)

اے ایمان والو۔ اللہ اور اس کے رسول کی اطاعت کرو اور ان لوگوں کی جو تم سے اولی الامر ہوں۔

۲۔ متقی ہو

سربراہ مملکت بہترین آدمی انتخاب کیا جاتا ہے اور اللہ کے نزدیک بہترین آدمی صرف متقی ہوتا ہے۔ ارشاد باری ہے۔

اِنَّ اَكْرَمَكُمْ عِنْدَ اللّٰهِ اَتْقٰىكُمْ (حجرات ۴۹)

اللہ کے نزدیک تم میں سے معزز وہ ہے جو زیادہ پرہیزگار ہے۔

© rasailojaraid.com

© rasailojaraid.com

۴۔ صاحب علم بھی اور بہادر بھی

بنی اسرائیل نے جالوت سے مقابلہ کے لیے اپنے نبیؑ سے درخواست کی کہ خدا تعالیٰ ہم میں سے کوئی بادشاہ مقرر کر دے۔ اللہ تعالیٰ نے طالوت کو بادشاہ نامزد کر دیا تو کہنے لگے کہ اس سے تو ہم ہی بادشاہت کے زیادہ حق دار ہیں وہ تو تنگ دست آدمی ہے، نبیؑ نے ان سے فرمایا۔

إِنَّ اللّٰهَ اصْطَفٰهُ عَلَيْكُمْ وَزَادَهٗ بَسْطَةً فِي الْعِلْمِ وَالْجِسْمِ۔ (البقرۃ)

اللہ نے تم میں سے اسے انتخاب کیا اور اسے علم اور جسم (طاقت) میں کشادگی دی گئی ہے۔

صاحب بصیرت ہو اور قوت فیصلہ رکھتا ہو۔

حضرت داؤدؑ کے متعلق اللہ تعالیٰ فرماتے ہیں:

وَاٰتَيْنٰهُ الْحِكْمَةَ وَفَصْلَ الْخِطَابِ (ص)

ہم نے اسے حکمت اور فیصلہ کن بات کرنے کی صلاحیت دی۔

اگر چالیس سال سے زائد عمر کا ہو تو بہتر ہے۔ کیونکہ انسان چالیس سال کے بعد پختہ عقل ہوتا ہے۔

حَتّٰى إِذَا بَلَغَ أَشُدَّهٗ وَبَلَغَ أَرْبَعِيْنَ سَنَةً (الاحقاف)

یہاں تک کہ (انسان) بھرپور جوان ہوتا اور چالیس سال کی عمر کو پہنچتا ہے۔

۵۔ اسے عوام کا اعتماد حاصل ہو

حضور اکرمؐ کی وفات کے بعد سقیفہ بنی ساعدہ میں مہاجرین و انصار کے درمیان خلافت کا جھگڑا پیدا ہوا تو حضور اکرمؐ کے اس فرمان کے تحت مفاہمت ہوئی تھی،

اَلْاَئِمَّةُ مِنَ الْقُرَيْشِ۔ "امام قریش قبیلہ سے ہونے چاہئیں"

اور یہ کوئی نسلی تفوق کی بات نہ تھی۔ اس ارشاد کی وضاحت حضرت ابو بکرؓ نے ان الفاظ میں کی آپ نے انصار کو مخاطب کر کے فرمایا۔

"ہمیں تمہارے فضائل و مناقب اور خدمات اسلامی کا پورا پورا اعتراف ہے لیکن بدوی قبیلے قریش کے علاوہ کسی اور خاندان کی امارت تسلیم نہیں کریں گے۔ لہٰذا بہتر یہی ہے کہ امیر مہاجرین میں سے ہو۔"[1]

۶۔ ذمہ داریوں کو نبھانے کی صلاحیت رکھتا ہو۔

ارشاد باری ہے۔

إِنَّ اللّٰهَ يَأْمُرُكُمْ أَنْ تُؤَدُّوا الْأَمٰنٰتِ إِلٰى أَهْلِهَا۔ (النساء)

اللہ تعالیٰ تمہیں حکم دیتا ہے کہ امانتیں اس کے مستحق کے حوالے کرو۔

[1] تاریخ اسلام۔ پروفیسر حمید الدین

© rasailojaraid.com

© rasailojaraid.com

ووٹ ایک مقدس امانت ہے لہٰذا یہ امانت ایسے شخص کے سپرد ہونی چاہئے جو سیاست و ریاست کی ذمہ داریاں نباہ سکے۔

۷۔ رائے دہندہ کا معیار

۱۔ بصیرت:

ووٹ یا رائے دراصل ایک مشورہ ہے کہ موجودہ نمائندگان میں کون ملک و قوم کی مفید خدمات انجام دے سکتا ہے۔ اب ذرا اس حقیقت کو نجی سطح پر سوچئے۔ کیا آپ اپنے ذاتی معاملات میں ہر کس و ناکس سے مشورہ لینا گوارا کر لیتے ہیں؟ فرض کیجئے آپ کے رشتہ داروں اور حلقہ احباب کی تعداد "ب" کے لگ بھگ ہے۔ تو کسی خاص معاملہ پر مشورہ کرنے کے لیے آپ ایک ایک کے اخلاق و عادات اور اس کی فہم و فراست کو پرکھتے ہیں اور بالآخر صرف دو ایک پر آپ کی نظرِ انتخاب پڑتی ہے۔ جن کے متعلق آپ کو یقین آ جاتا ہے کہ یہ اشخاص خلوص اور دیانتداری سے مشورہ دے سکیں گے۔ تو یہاں معاشرتی مساوات آپ کو کیوں گوارا نہیں ہوتی؟ پھر کیا سیاست اور ریاست کا معاملہ... جس پر کسی قوم کے مستقبل پر گہرے اثرات مرتب ہوتے ہیں... ہی ایسا گیا گزرا معاملہ ہے کہ اس میں رائے اور مشورہ سے متعلق حدود و قیود کی ضرورت نہ ہو؟ لہٰذا رائے صرف اہل الرائے یا صاحبِ فہم و فراست سے ہی لی جائے گی۔

۲۔ امانت

جس طرح ایک نمائندہ کے لیے امین ہونا ضروری ہے اسی طرح ایک رائے دہندہ کے لیے بھی امین ہونا لازمی شرط ہے۔ ارشاد نبوی ہے۔

اَلْمُسْتَشَارُ مُؤْتَمَنٌ ۔ جس سے مشورہ طلب کیا جائے اسے امانت داری سے مشورہ دینا چاہیے۔

اسے اپنے ذاتی مفادات یا نسلی اور پارٹی کے تعصب سے بالاتر ہو کر مشورہ دینا ہوگا۔ ورنہ وہ مجرم ہے۔ کیونکہ اس نے امانت میں خیانت کی ہے۔ اگر یہ مشورہ کوئی راز کی بات ہے تو اس کو ظاہر کرنا بھی خیانت ہے۔

۳۔ تقویٰ اور راست بازی

اگر کسی سے مشورہ لیا جائے تو یہ ضروری نہیں کہ مشورہ لینے والا اسے ضرور قبول بھی کرے۔ بلکہ اس مشورہ پر تحقیق کا عمل جاری رہے گا کہ آیا رائے دہندہ نے فی الواقعہ ان حدود و قیود کی پابندی کی ہے جو اس کے لیے ضروری تھیں؟ ارشاد ربانی ہے۔

يَا أَيُّهَا الَّذِينَ آمَنُوا إِذَا جَاءَكُمْ فَاسِقٌ بِنَبَإٍ فَتَبَيَّنُوا (۴۹/۲) اے ایمان والو! اگر کوئی فاسق تمہارے پاس کوئی خبر لے کر آئے تو اس کی تحقیق کرو۔

معلوم ہوا کہ فاسق کی شہادت معتبر نہیں ہے اور ووٹ بھی ایک شہادت ہے جس سے قلبی یقین و اطمینان کا اظہار

© rasailojaraid.com

© rasailojaraid.com

کیا جاتا ہے۔ لہٰذا ایسے آدمی کو رائے دینے کا کوئی حق نہیں ہے اور ایسے آدمی سے رائے لینے کی بھی کوئی وجہ جواز نہیں ہے۔

دوسرے مقام پر فرمایا۔

"اِنَّ الَّذِيْنَ يَرْمُوْنَ الْمُحْصَنٰتِ ثُمَّ لَمْ يَاْتُوْا بِاَرْبَعَةِ شُهَدَآءَ فَاجْلِدُوْهُمْ ثَمٰنِيْنَ جَلْدَةً وَّلَا تَقْبَلُوْا لَهُمْ شَهَادَةً اَبَدًا" ۳۴

"جو لوگ پاک دامن عورتوں پر تہمت لگاتے ہیں پھر چار گواہ پیش نہیں کر سکتے انکو اسّی درے مارو اور آئندہ ان کی شہادت ہرگز قبول نہ کرو"

معلوم ہوا کہ جو شخص جھوٹی تہمت کا مرتکب ہو چکا ہے ایسے معاشرہ میں غیر معتبر متصور کیا جاتے گا کہ تو کسی معاملہ میں اس کی شہادت قبول کی جاسکتی ہے اور نہ ہی ایسے رائے دینے کا حق دیا جا سکتا ہے کیونکہ وہ غیر معتبر ہے۔

۸۔ شورائی نظام

قرآن کریم کے ارشاد وَاَمْرُهُمْ شُوْرٰى بَيْنَهُمْ کے مطابق عہد نبوی میں ہی مجلس شوریٰ قائم ہو چکی تھی اس مجلس میں اہل الرائے اور صاحب بصیرت صحابہ شامل تھے جملہ انتظامی تو اجتہادی امور اس مجلس کے مشورہ سے طے پاتے تھے اور اس کی حیثیت کابینہ کی تھی عہد فاروقی میں مجلس شوریٰ کے علاوہ ایک جنرل اسمبلی بھی قائم کی گئی۔

جب کوئی اہم معاملہ خلیفہ وقت اور مجلس شوریٰ سے طے نہ پاسکتا تو اَلصَّلٰوةُ جَامِعَةٌ کی منادی کرا کے مسجد میں اجلاس طلب کر لیا جاتا۔ اور پھر عامۃ الناس کے فیصلے کا احترام کیا جاتا۔ مثلاً جنگ قادسیہ میں حضرت عمرؓ خود فوج کی کمان کرنا چاہتے تھے اور اس کی تیاری بھی کر چکے تھے فوج اور عوام کی بھی یہی مرضی تھی لیکن مجلس شوریٰ اس کے خلاف تھی وہ حضرت عمرؓ کا دار الخلافت میں رہنا اور خدا نخواستہ نامساعد حالات کی صورت میں کمک بھیجنا زیادہ ضروری سمجھتی تھی اندریں صورت حضرت عمرؓ نے جنرل اسمبلی کا اجلاس طلب کیا اور فریقین کے دلائل سامنے رکھ دیئے۔ اس اجلاس نے مجلس شوریٰ کی رائے کی تائید کی چنانچہ آپ نے اپنی جگہ لشکر کی کمان حضرت سعد بن ابی وقاصؓ کے سپرد کر دی۔ اسی طرح عراق و شام کی مفتوحہ زمینوں کے مسئلہ کو بھی عامۃ المسلمین کے اجلاس میں طے کیا گیا تھا۔

مجلس شوریٰ میں ہر طرح کے معاملات طے پاتے مثلاً صوبوں کے گورنر اور دوسرے بڑے بڑے عہدیداروں کا تقرر اور برطرفی، سپاہ کی تنخواہ، انتظامی اداروں کا قیام، دفاتر کی ترتیب، خراج کی شرح، غیر قوموں سے تجارتی تعلقات وغیرہ وغیرہ۔ مشاورت کے لیئے جب کبھی ضرورت ہوتی تو صوبائی نمائندوں کو بھی شامل کر لیا جاتا تھا۔

۹۔ تنقید کا حق اور حدود:

مجلس شوریٰ کے ممبران کسی مسئلہ میں آپس میں اختلاف کر سکتے ہیں۔ لیکن حزب اختلاف کی طرح ایک مستقل وجود نہیں رکھتے اور نہ ہی یہ پارٹی بازی کا تقاضا ہے اسلامی معاشرہ ہر مسلمان حکومت کی

© rasailojaraid.com

© rasailojaraid.com

پالیسیوں پر حتیٰ کہ خلیفہ کے ذاتی معاملات تک پر تنقید کا حق رکھتا ہے حضرت ابوبکرؓ اور حضرت عمرؓ نے خود عوام کو یہ دعوت دی کہ وہ ان کے اعمال کا محاسبہ کیا کریں۔ اور آپ نے کئی بار ایسی تنقید بطیب خاطر قبول کی جنرل اسمبلی کے ایک اجلاس میں ایک شخص نے بار بار کہا "کہ اے عمرؓ خدا سے ڈر" کسی نے اسے چپ کرانے کی کوشش کی تو حضرت عمرؓ نے منع فرمایا اور کہا کہ "اگر یہ شخص چپ رہا تو اس کے آنے کا فائدہ کیا تھا۔ اور اگر ہم نے اس کی بات غور سے نہ سنی تو مشورہ کا مقصد ہی فوت ہو جائیگا۔

۱۰۔ حکومت کا نظم و نسق

حکومت کا نظم چلانے کے لیئے تین ہی بنیادی ادارے ہوتے ہیں مقننہ، عدلیہ، اور انتظامیہ۔ ایسے سب عہدیداروں کی تقرری میں مجلس شوریٰ کے علاوہ وہاں کے مقامی باشندوں سے بھی رائے لی جاتی تھی۔ ان سب عہدیداروں کے لیے علم تقویٰ اور امانت و دیانت کے اوصاف سے متصف ہونا ضروری تھا۔ علاوہ ازیں ہر محکمہ کے عہدیدار کے لیے کچھ دوسری صلاحیتوں کی بھی ضرورت ہوتی ہے۔ ان کا بھی لحاظ رکھا جاتا تھا مثلاً قاضی کے تقرر کے لیے مندرجہ بالا اوصاف کے علاوہ یہ بھی ضروری تھا کہ وہ قرآن و حدیث کے مسائل کا استنباط کر سکتا ہو۔ قوت فیصلہ رکھتا ہو اور کسی بڑی سے بڑی شخصیت سے مرعوب ہوئے بغیر جانبداری سے فیصلہ دینے کی جرأت رکھتا ہو حضرت عمرؓ ان باتوں کا خاص خیال رکھتے تھے۔ بلکہ خود امتحان بھی لیا کرتے تھے۔ اگر کسی علاقہ کے لوگ کسی گورنر یا قاضی کے متعلق معزولی کا مطالبہ کرتے اور ان کی شکایات جائز ہوتیں تو ان کی رائے کا احترام کرتے ہوئے ایسے گورنر کو یا تبدیل کر دیتے یا معزول کر دیا جاتا تھا۔ گویا جمہوریت کی روح ہر شعبہ میں پوری طرح کار فرما تھی۔

۱۱۔ احتساب کا عمل:

اسلامی نظام میں احتساب بہت زیادہ اہمیت کا حامل اور اس کی روح رواں ہے۔

حضرت عمرؓ حج کے موقع پر تمام صوبوں کے گورنروں کو وہاں بلا لیتے اور عام اعلان کر دیتے کہ جس کسی کو اپنے حاکم سے شکایت ہو آ کر پیش کرے۔ شکایات کی باقاعدہ تحقیق و تفتیش کی جاتی اور اگر حاکم قصوروار ہوتا تو اسے مجمع عام میں سرزنش کی جاتی اور عہدہ سے معزول کر دیا جاتا تھا حتیٰ کہ حضرت ابو عبیدہؓ بن جراح اور حضرت امیر معاویہؓ کے علاوہ کوئی گورنر بھی حضرت عمرؓ کی باز پرس سے محفوظ نہ تھا۔ ایسے ہی موقعہ پر ایک شخص نے حضرت عمروؓ بن عاص گورنر مصر کے متعلق شکایت کی کہ اس نے بلا وجہ مجھے سو درے مارے ہیں۔ حضرت عمرؓ نے فرمایا "اٹھو اور اپنا بدلہ لے لو" عمروؓ بن العاص کہنے لگے "امیر المومنین! اس طرح تو تمام عمال بد دل ہو جائیں گے" حضرت عمرؓ نے فرمایا "تاہم ایسا ضرور ہوگا" پھر مستغیث کی طرف متوجہ ہوئے کہ اٹھو اور اپنا کام کر۔ عمروؓ بن العاصؓ نے مستغیث کو اس بات پر راضی کر لیا کہ وہ سو دینار لے لے اور اپنے دعویٰ سے باز آئے۔ (کتاب الخراج ص ۶۶)

© rasailojaraid.com

© rasailojaraid.com

۱۲۔ مساوات

اسلام حق رائے دہی میں مساوات کا قائل نہیں ہے۔ کیونکہ ہر شخص کی فہم و بصیرت میں تفاوت فطری بات ہے گلی کے ایک خاکروب اور سربراہِ مملکت کی سیاست و ریاست میں بصیرت ایک جیسی نہیں ہو سکتی نہ ہی ایک غنڈے، بدمعاش کی شہادت ایک راست باز کے ہم پلہ قرار دی جا سکتی ہے اسلام سیاست و ریاست کے باب میں مرد و زن کی مساوات کو بھی تسلیم نہیں کرتا۔ کیونکہ ان دونوں کے فطری تقاضے اور دائرہ ہائے کار الگ ہیں جس کی تفصیل پہلے گزر چکی ہے۔

اسلامی نقطہ نظر سے سیاسی مساوات کا مفہوم یہ ہے کہ وہ نہ تو فاشزم کی طرح اقتدار پر کسی خاص قوم کا حق تسلیم کرتا ہے اور نہ ملوکیت کی طرح کسی خاص خاندان کا۔ وہ مغربی جمہوریت کی طرح ہر نیک و بد کا حق بھی تسلیم نہیں کرتا۔ وہ اس افراط و تفریط میں اعتدال کی راہ اختیار کرتا ہے۔ بلاشبہ وہ ہر انسان کو بحیثیت انسان اور آدم کی اولاد ہونے کے یکساں درجہ عطا کرتا ہے۔ لیکن شرف کا معیار تقویٰ قرار دے کر اقتدار کو ہر کس و ناکس کے حوالے نہیں کرتا۔ یہاں ایک نکما، پست قد حبشی تو سربراہ مملکت بھی بن سکتا ہے لیکن ایک خوش رنگ و دراز قد اور بدکردار انسان کسی معمولی عہدہ پر بھی فائز نہیں ہو سکتا۔

مساوات کا دوسرا پہلو معاشرتی مساوات ہے۔ سب مسلمان آپس میں بھائی بھائی ہیں خواہ کسی علاقہ، طبقہ یا نسل سے تعلق رکھتے ہوں۔ نماز میں آقا و نوکر، امیر و غریب، کالے اور گورے سب ایک صف میں ساتھ مل کر کھڑے ہوں گے۔ یہاں نہ تو ہندوازم کی طرح طبقاتی تقسیم ہے کہ اس میں محنت کش طبقہ (اچھوت) کو اتنا ناپاک قرار دیا گیا ہے کہ برہمن کے ساتھ لگ جانے سے برہمن بھی ناپاک ہو جاتا ہے اور نہ ہی عیسائیوں کی طرح امیر و غریب کا امتیاز ہے کہ امراء کے گرجے الگ ہوں اور غرباء کے الگ۔ علاوہ ازیں امراء گرجوں میں کرسیوں پر براجمان ہوں اور غریب فرش پر بیٹھیں۔ نیز مسلمانوں کو یہ حکم بھی دیا گیا ہے کہ مالک اپنے نوکروں کو اپنے جیسا کھلائیں اور پہنائیں اور ان کے ساتھ بیٹھ کر کھانا کھانے میں عار محسوس نہ کریں۔ اسلام میں اگر برتری کا تصور ہے تو وہ تقویٰ جیسی اعلیٰ اخلاقی قدر پر ہے۔

مساوات کا تیسرا پہلو قانونی مساوات ہے۔ مساوات ہی کا کرشمہ ہے کہ ایک یہودی خلیفۃ المسلمین کو عدالت میں لا کھڑا کر سکتا ہے اور حکومت کو یہ حکم ہے کہ وہ فریقین کے ساتھ یکساں سلوک کرے جب کہ ہم دیکھتے ہیں کہ دوسرے تمام دساتیر میں ایسی دفعات موجود ہیں جن کی رو سے اساطین حکومت کو عدالت طلب بھی نہیں کر سکتی۔ ہمارے پاکستان کے آخری دستور اپریل ۱۹۷۳ میں بھی ... اسلامی جمہوریہ ہونے کے باوجود بھی ..... ایسی دفعات موجود ہیں جن کی رو سے ملک کا صدر، وزیر اعظم، صوبوں کے وزرائے اعلیٰ اور گورنروں پر مقدمات فوجداری

© rasailojaraid.com

© rasailojaraid.com

میں ملوث قرار دیئے جا سکتے ہیں اور نہ ہی انہیں کوئی بڑی سے بڑی عدالت طلب کر سکتی ہے۔ اسلامی ریاست میں مساوات کا یہ تصور اسے دوسرے تمام ادیان اور ازموں سے ممتاز کر دیتا ہے۔

۱۴۔ نظامِ معیشت

اسلام اشتراکیت کے مزعومہ دعویٰ "معاشی مساوات" کا قائل نہیں ہے، کیونکہ معاشی مساوات ایک غیر فطری چیز ہے۔ ہر انسان کی ضروریات الگ الگ نوعیت اور حیثیت کی ہوتی ہیں۔ ایک کسان کی ضروریات، ایک چیف جسٹس کی ضروریات کے مناسب اور برابر نہیں ہو سکتیں۔ حالانکہ دونوں معاشرہ کے لابدی رکن ہیں۔ اشتراکیت کا یہ دعویٰ پر بنائے خود اس قدر غلط ہے کہ اس پر اشتراکیت کے مادرِ وطن روس میں بھی آج تک صحیح طور پر عمل نہیں ہو سکا۔

معاشی مساوات کے نعرہ کو محض دوسرے ممالک میں تخریب کاری کے لیے استعمال کیا جاتا ہے اور اس پر فریب نعرہ سے مزدور اور آجر کو، کسان اور مزارعہ کو، کرائے دار اور مالک مکان کو غریب اور امیر کو آپس میں گتھم گتھا کر دیا جاتا ہے۔ اسلام نے ایسے تمام تنازعات کا حل ایک ہی ارشاد میں بیان فرمایا ہے۔ ارشاد نبوی ہے۔

"من لم يوقر كبيرنا ويرحم صغيرنا فليس منا" جس نے اپنے بڑے کی عزت نہ کی۔ اور اپنے چھوٹے پر شفقت نہ کی تو وہ ہماری امت سے نہیں!

مزید برآں اشتراکیت میں ہر شخص کی انفرادی حیثیت ختم ہو جاتی ہے۔ اور وہ محض ایک مشین کا پرزہ بن کر رہ جاتا ہے جب کہ اسلام بنیادی حقوق کا پورا تحفظ کرتا اور انفرادی ملکیت کو تسلیم کرتا ہے وہ فرد اور معاشرہ کے حقوق میں ایک معقول توازن قائم کر کے اسے ایک فلاحی مملکت بنانا چاہتا ہے۔

اسلام سرمایہ داری کا بھی قائل نہیں ہے۔ وہ قانونِ میراث کے ذریعے اس کی جڑیں ہلا دیتا ہے۔ نظام زکوٰۃ و صدقات سے معاشرہ میں طبقاتی تقسیم کو کم کرتا ہے اور نظامِ سرمایہ داری کے دو اہم ستونوں، سود اور ناجائز ٹیکس، کو ناجائز قرار دے کر نظامِ سرمایہ داری پر کاری ضرب لگاتا ہے۔

ملوکیت میں قومی خزانہ بادشاہ کی جاگیر ہوتا ہے اور جمہوریت میں حکمران پارٹی کے مفادات اور صوابدید پر بے دریغ خرچ کیا جاتا ہے۔ اسلامی نظامِ معیشت میں بیت المال یا قومی خزانہ قوم کی امانت ہے اور اس میں سربراہِ مملکت یا ناظمین کا بے جا تصرف بدترین قسم کی خیانت ہے جب حضرت ابوبکرؓ خلیفہ منتخب ہو گئے تو دوسرے دن حسبِ سابق کپڑے کی گٹھڑی کندھے پر لادے بازار کو نکل کھڑے ہوئے۔ حضرت عمرؓ راستہ میں مل گئے پوچھا "کیا بات ہے؟" حضرت ابوبکرؓ نے جواب دیا "بچوں کو کہاں سے کھلاؤں؟" حضرت عمرؓ نے فرمایا "اب امت کا بار آپ کے سر پر آ پڑا ہے آپ کو تمام تر توجہ اس طرف دینی چاہیے۔ رہا معاش کا مسئلہ تو اس کے لیے ابو عبیدہؓ۔ جو اس وقت ناظم بیت المال تھے۔ کے پاس چلتے ہیں۔"

© rasailojaraid.com

© rasailojaraid.com

چنانچہ دونوں حضرات حضرت ابو عبیدہؓ کے پاس خود تشریف لے گئے اور تینوں کے مشورہ سے حضرت ابوبکرؓ کی تنخواہ ایک عام آدمی کے گزران کے مطابق چار ہزار درہم سالانہ پائی۔ حضرت ابوبکرؓ دو سال خلیفہ رہے۔ اور دو ہی سال یہ تنخواہ لی۔ اپنی وفات سے قبل یہ وصیت کی کہ "میرا مکان بیچ کر ۸ ہزار درہم (جو وہ بصورتِ تنخواہ بیت المال سے وصول کر چکے تھے) بیت المال کو واپس کر دیئے جائیں" حضرت عمرؓ نے جب یہ بات سنی تو فرمانے لگے کہ "خدا ابوبکرؓ پر رحمت فرمائے۔ انہوں نے بعد میں آنے والوں کو تھکا دیا"[1]

بعد میں آنے والے خلفاء نے بھی اس امانت کو امانت ہی سمجھا۔ حضرت عمرؓ نے ایک دفعہ تقریر کے دوران فرمایا:

"میرا تمہارے مال سے ایسا ہی تعلق ہے جیسا یتیم کے مال سے اس کے والی کا تعلق ہوتا ہے"

۱۴۔ نظریہ قیامِ امن

اسلامی ریاست میں حدود اللہ کا نفاذ لازمی ہے اور اس کے بغیر جرائم کا استیصال نہیں ہو سکتا۔ تاریخی شواہد اور مشاہدہ بھی اس حقیقت کی تائید کرتے ہیں۔ لیکن آج کے دور میں بدنی سزا کو غیر انسانی سلوک قرار دیا جا رہا ہے۔ اقوامِ متحدہ کے بنیادی حقوق کے چارٹر میں یہ شق موجود ہے۔ ہم حیران ہیں کہ اگر انسانی جسم کو بچانے کے لیے پھوڑے کا آپریشن صرف جائز ہی نہیں بلکہ اسے عین انسانی ہمدردی سمجھا جاتا ہے۔ تو معاشرہ کے لیے ایک بدمعاش کو بدنی سزا دینا کیسے غیر انسانی سلوک بن جاتا ہے؟ بدمعاش پر رحم کر کے معاشرہ میں بدامنی کو کیوں گوارا کیا جاتا ہے؟ کیا یہ معاشرہ کے ساتھ غیر انسانی اور ظالمانہ سلوک نہیں ہے؟ پھر یہ بات بھی قابلِ غور ہے کہ غیر انسانی سلوک کے یہ علمبردار اپنے ممالک میں قیامِ امن میں کہاں تک کامیاب ہوئے ہیں؟ ہمارے خیال میں غنڈہ عناصر کی اس پشت پناہی کی وجہ محض یہ ہے کہ غیر انسانی سلوک کے علمبردار خود غنڈہ عناصر کے رحم و کرم کے محتاج اور اسی راستہ سے برسرِ اقتدار آتے ہیں۔ اور یہ طریق موجودہ جمہوری طرزِ حکومت میں بالعموم مشاہدہ کیا جا سکتا ہے۔ ایسے لوگ اپنے معاونین کے حق میں بدنی سزا کیسے گوارا کر سکتے ہیں؟ رہی عدالتی کاروائی تو اس میں سزا سے بچ جانے کے سینکڑوں طریقے رائج ہیں جنہیں عام لوگ بھی بخوبی جانتے اور سمجھتے ہیں۔

اس کے علاوہ اسلام قیامِ امن اور عدل و انصاف کے کئی مؤثر طریقے اختیار کرتا ہے۔ مثلاً اسلام کا قانونِ شہادت اور گواہ کے اوصاف، جس کی بنا پر کسی مقدمہ کا بہت جلد اور درست تصفیہ ممکن ہو جاتا ہے۔ اسی طرح محکمہ پولیس اور عدلیہ کے عہدیداروں کی تقرری میں تقویٰ و دیانت کا التزام، اور ان کی تنخواہوں کا معیار، غرضیکہ بے شمار ایسے احکام و ہدایات موجود ہیں جن پر عمل پیرا ہونے سے جرائم کی تعداد حیران کن حد تک کم ہو جاتی ہے۔ اور تھوڑے سے بہت جو مقدمات عدالتوں میں آتے ہیں وہ جلد از جلد فیصل ہو جاتے ہیں۔

[1] کنز العمال۔ ج ۵۔ ص ۲۲۸

© rasailojaraid.com

© rasailojaraid.com

حصولِ انصاف کے لیے کورٹ فیس ایک غیر اسلامی چیز اور مدعی یا مستغیث پر ظلم کے مترادف ہے۔ اسلامی نظام عدل میں وکلاء صاحبان کی بھی ضرورت نہیں رہتی کیونکہ جج صاحبان کے لیئے یہ ہدایت ہے کہ وہ مدعی اور مستغیث کی بات بڑی ہمدردی سے سنیں۔ اور ان پر کمرۂ عدالت کا رعب کسی حالت میں طاری نہ ہونا چاہیے۔ ان چند در چند اقدامات نے انصاف کے حصول کو اتنا آسان بنا دیا ہے کہ جس کی نظیر باقی دنیا میں ملنا مشکل ہے۔

اسلامی ریاست کے اس اجمالی خاکہ سے یہ واضح ہو جاتا ہے کہ بنی نوع انسان کے لیئے خدا کے نازل کردہ دستور سے بہتر دستور پیش کرنا ممکن نہیں ہے۔

آج کی "مہذب" دنیا ظلم و جور سے بھر چکی ہے۔ ہر جگہ ہنگامے، فساد، انتشار اور انقلاب برپا ہو رہے ہیں۔ جرائم کی روز افزوں ترقی سے امنِ عامہ تباہ ہو چکا ہے۔ تمام دنیا مضطرب ہے اور امن و سکون کہیں بھی نظر نہیں آتا۔ انسان کا اپنا بنایا ہوا قانون ان مسائل کو حل کرنے میں ناکام ہو چکا ہے۔ اور یہ مسائل اس وقت تک حل ہونا ناممکن نظر آتے ہیں۔ جب تک انسانیت خدائے واسع علیم کے نازل کردہ قانون کی طرف رجوع نہ کرے۔ (جاری ہے)

بقیہ دوام حدیث۔ حضور کا ارشاد ہے کہ نکاح کرو تاکہ امت بڑھے قیامت میں میں فخر کروں، عیسائیوں کی رہبانیت اختیار نہ کرو "تزوجوا فانی مکاثر بکم الامم ولا تکونوا کرھبانیۃ النصاریٰ (اخرجہ البیھقی عن ابی امامۃ بسند ضعیف) نکاح سے غرض بچے نہیں ہیں۔ اگر یہ بات ہوتی تو رہبانیت کے لیے شاید کچھ تک نکل آتی مگر یہاں تو بات تکثیرِ امت کی ہے، پھر اس سے کترانا تو گناہ ہوا ثواب کہاں؟ "تزوجوا ولا تطلقوا فان اللہ لا یحب الذواقین ولا الذواقات" (اخرجہ الطبرانی عن ابی امامۃ) "نکاح کرو طلاق دے کر مزے نہ بدلتے رہو، چسکا بدلنے والے خدا کو پسند نہیں ہیں۔"

عورت رفیقِ حیات ہے، دسترخوان نہیں ہے، اس لیے جن لوگوں نے اس کا احساس نہیں کیا، وہ اس سفر میں "ناکام" سمجھے جائیں گے ــــ ازدواجی زندگی سے غرض "لطف اندوزی" نہیں، توالد اور تناسل کے ذریعے بقا اور ازدیادِ نوع ہے۔ اور یہ وہ مرحلہ ہے جس میں دونوں کی حیثیت اور ذمہ داری یکساں ہے ــــ ہاں اس ذمہ داری سے عہدہ برآ ہونے کے لیے اس کو پرکشش بنا دیا ہے تاکہ انسان اس لمبی دوڑ اور سفر میں ہمت نہ ہار دے، اور یہ بوجھ اس کے لیے بوجھ نہ رہے ــــ بانجھ عورت سے بکثرت بچے جننے والی خاتون کو اس لیے ترجیح دی گئی ہے کہ وہ بقائے نوع کا ذریعہ ہے، ورنہ ظاہر ہے کہ زندگی کی لطیف رعنائیوں اور چاشنی کے لیے تو بانجھ ہی بہتر رہتی۔ ہاں اس سے ہماری یہ غرض نہیں کہ بانجھ عورت سے نکاح ہی نہیں چاہیے، یہ غلط ہے بلکہ نکاح کرو، اگر بچے نہیں ہوسکے تو اور نکاح کر لو تاکہ اولاد بڑھے ــــ مگر مساواتِ شرعی کا دامن ہاتھ سے نہ چھوٹنے پائے۔ ورنہ سخت پکڑ ہو گی ــــ یعنی سب بیویوں کے حقوق یکساں ادا کیئے جائیں۔ کسی سے کوئی بے انصافی نہ ہو۔

© rasailojaraid.com